دعوتِ خلافت

اور

منہجِ رسول ﷺ

تالیف:

مولانا عاصم عمر دامت برکاتھم

ادارہ حطین

پیش لفظ

بسم الله والحمدلله والصلوة والسلام علی رسول الله وبعد،

اگرچہ برصغیر دینی جماعتوں اور اسلامی تحریکات کا ایک مضبوط مرکز رہا ہے، سالہا سال مختلف دعوتی تحریکات یہاں برپا رہی ہیں اور ہر تحریک نے اپنی دعوت کو زبان و بیان کے ذریعے عوام تک پہنچایا بھی ہے، لیکن اردو زبان میں ایسی تحریرات کی کمی کافی عرصے سے محسوس ہو رہی تھی جو خود ان حضرات کو مخاطب کریں جو دوسروں کو دعوت دینے کے نازک مقام پہ فائز ہیں اور ان کے سامنے دعوت دینے کے شرعی آداب اور دعوت کے اصول وضوابط واضح کریں۔ زیرِ نظر کتابچہ مجاہد عالمِ دین 'مولانا عاصم عمر' دامت برکاتھم کی ایک مختصر مگر پر مغز تحریر ہے جو مذکورہ خلاء کو پُر کرنے کی سمت ایک اہم قدم ہے۔ اس کتابچے میں آپ نے اپنے روایتی، دل میں پیوست ہو جانے والے انداز سے داعیانِ دین کو مخاطب کیا ہے اور آیاتِ قرآنی اور اسوۂ انبیاء علیہم السلام کی مدد سے دعوت دینے کے کچھ اہم آداب واضح کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس قابلِ قدر کاوش پہ بہترین جزا سے نوازے اور اسے دیگر اہلِ علم کو تحریض دلانے کا ذریعہ بھی بنا دے تاکہ وہ دعوتِ دین کے شرعی اصول وضوابط سے متعلق دیگر پہلوؤں پر بھی قلم اٹھائیں اور اس غیر معمولی اہمیت کے موضوع پہ شریعت کی تعلیمات کو معاشرے بالخصوص دینی تحریکات کے کارکنان کے سامنے سہل اسلوب میں پیش کریں۔

یہ تحریر اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مصنف بھی قافلہء جہاد کے راہی ہیں اور اس تحریر کے مخاطبین میں بھی قافلہء جہاد سے منسلک سر فروش سرِ فہرست ہیں۔ دعوتِ دین کو پھیلانا اور اللہ کے کلمے کو سربلند کرنا جہاد کا اساسی مقصد ہے۔ ہر مجاہد ایک ہی وقت میں مقاتل مجاہد بھی ہوتا ہے اور دنیا والوں کے نام ایک پیغام کا حامل داعی بھی۔ پھر قتال کے لیے شریعت نے الگ آداب سکھلائے ہیں اور دعوت کے لیے الگ۔ دعوت و قتال کے آداب سے واقفیت اور ان کی پابندی ہی اس بات کی ضمانت ہو سکتی ہے کہ مجاہدینِ فی سبیل اللہ اپنے کٹھن سفر کے دوران کسی بھی لمحے شریعت کے احکامات کی سرِ مو مخالفت نہ کریں اور ان کی تحریک دنیا میں بھی وہ مطلوبہ نتائج پیدا کرے جو ہر اہلِ ایمان کی دل کی ٹھنڈک کا باعث بنیں۔ اسی لیے مجاہدین کو بالخصوص اس کتابچے کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے اور ان نبوی آداب سے اپنی سیرتوں کو مزین کرنا چاہیے۔ ہم خصوصیت سے مجاہدین کے ذمہ داران، ان کے میڈیا سے متعلق شعبہ جات کے اراکین، ان کے مقررین و خطباء، مصنفین و ادباء، مربیین وعلماء، نیٹ کی دنیا میں دعوت دینے میں مصروف گمنام سپاہیوں اور میدانِ

عمل میں سینہ بہ سینہ دعوت منتقل کرنے والے مجاہد بھائیوں سے درخواست کریں گے کہ اس کتاب کو دل کی آنکھوں سے پڑھیں اور اپنے علمی و عملی نصاب میں شامل کریں..... تاکہ احیائے خلافت اور نفاذِ شریعت کی داعی یہ مبارک تحریک رب کی رضا اور اس کی مدد و نصرت اور اہلِ ایمان کی تائید و قبولیت حاصل کر سکے۔

اس کتابچے کے ہر صفحے پہ بین السطور یہ پیغام بھی پوشیدہ ہے کہ اس امت کے لیے انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کے لیے کتاب وسنت کافی ہیں؛ مسئلہ ایک فرد کے ظاہر وباطن کی اصلاح کا ہو یا لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پہ ان مٹ نقوش چھوڑ جانے والی تحریکات کی بناء کا..... کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ نے ایسی مکمل، جامع اور عیب سے پاک رہنمائی ہمیں فراہم کر دی ہے کہ کسی اور سمت نگاہ اٹھا کر بھی دیکھنا اس عظیم نعمت کی ناقدری اور سراسر حماقت ہے۔ آج اس امت کے نوجوان ایسے اہلِ علم کی رہنمائی کے محتاج بھی ہیں اور پیاسے بھی جو مغربی فکر وفلسفے کے ایمان شکن حملوں کے درمیان آگے بڑھ کر انھیں سنبھال لیں، ان کے ذہن کی الجھن اور دل کی خلش کو حکمت، محبت اور دلسوزی سے دور کریں اور انھیں واپس محمدِ عربی ﷺ کے قدموں میں لے جا بٹھائیں۔

ربِ کریم اس امت کو اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی ﷺ کی سنت سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے کی توفیق بخشے، آمین!

وصلى الله على نبيّنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم!

مدیرِ حطین

مقدمہ

قوموں پر جب زوال آتا ہے تو یہ زوال کسی ایک شعبہ، طبقہ اور مخصوص میدان تک محدود نہیں رہتا بلکہ زندگی کے تمام شعبے اس کی زد میں آجاتے ہیں، افکار وخیالات میں جمود پیدا ہوجاتاہے، قویٰ شل، ہمتیں پست اور عملیت ختم ہوکر باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ اجتماعیت پارہ پارہ، دلوں میں تنگی اور نظر کی وسعت ایک پیٹ تک محدود ہوجایا کرتی ہے۔ اس زوال کی نحوست جہاں دینی معاملات پر پڑتی ہے، اسی طرح دنیاوی امور بھی اس کی زد میں آتے ہیں۔

چنانچہ امتِ مسلمہ پر جو زوال کا لمبا عرصہ گزرا ہے، اس نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ پستی سے بلندی کی جانب سفر کرنا اور اس سفر کے لیے قافلوں کو تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پستیوں میں رہ رہ کر پستیوں کو ہی اپنا مقدر سمجھنے والوں کی سمجھ میں یہ بات کیونکر آسکتی ہے کہ بلندیوں اور پہاڑوں کی چٹانوں میں نشیمن بنانے کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ جب دو وقت کی روٹی نیچے ہی میسر ہو تو بھلا اتنی بلندی پر جابسنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ چنانچہ ایسے لوگ اپنے آباؤ اجداد کی عقلوں کو بھی کم عقلی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی کی وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جاکر کیوں آباد ہوئے۔

پستی کے دلدادہ اور بلندیوں سے بےزار لوگوں کو رہنما و رہبر بھی ایسے ہی اچھے لگتے ہیں جو عروج کے بجائے زوال ہی کی جانب ان کی رہنمائی کرتے رہیں، اگر کوئی بلندی پر محوِ سفر ہونے کی دعوت بھی دے تو اس مشقت بھرے سفر کے لیے وہ قوم کہاں تیار ہوسکتی ہے جس کو ڈھلان سے اترنے کی عادت پڑ چکی ہو۔ سو ان کے واعظ، رہنما، شعرا اور ادیب انھیں پستیوں ہی میں رہنے کے فوائد سناتے ہیں اور اسی زندگی میں مگن رکھتے ہیں۔

چنانچہ غلامی کی پستی میں پڑی قوم کو عروج کی طرف سفر پر تیار کرنا آسان کام نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے داعیوں کو ایڑی چوٹی کا زورلگانا پڑتا ہے۔ لہٰذا 'احیائے خلافت' کی تحریک چلانے والے داعیوں، خطیبوں اور اہلِ قلم کو اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اس میدان میں قدم رکھنا ہوگا۔

کسی بھی انقلاب کی دعوت دینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہدِ مسلسل، انتھک محنت، صبر وتوکل اور حقیقت پسندی کی دولت سے مالا مال ہوں۔ دعوت کے میدان میں

مخالفین کی جلی کٹی باتوں سے بھڑک اٹھنے کے بجائے صبر کے جام حلق سے انڈیلنے کے عادی ہوں، دعوت کے نتائج آنکھوں سے نظر نہ آتا دیکھ کر دلبرداشتہ نہ ہوں بلکہ عرش و کرسی کے مالک پر توکل کرنے والے ہوں اور عزم ایسا کہ ہزار سال تک دعوت دینی پڑے اور ایک بندہ بھی اس کو قبول نہ کرے تو ان کی دعوت میں ایک لمحہ کے لیے بھی سستی اور تعطل پیدا نہ ہو۔

دین کی دعوت کیسے دی جائے؟

رسول اللہ ﷺ سے بہتر نمونہ ہمارے لیے کوئی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی دعوت کو امام الانبیاء ﷺ کی دعوت کے مطابق چلائیں، نیز ہماری دعوت اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جب یہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک طریقے پر ہوگی۔ اگر ہم نے اس بات کی پرواہ نہیں کی اور من مانے انداز میں دعوت دیتے رہے تو یاد رکھیے کہ بیشک ہماری بات کتنی ہی حق و سچ کیوں نہ ہو، اور ہم اخلاص کے سمندر میں کتنے ہی غوطہ زن کیوں نہ ہوں، لیکن اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے انداز میں غلطی کے سبب لوگ ہمارے ساتھ ہونے کے بجائے ہمارے دشمن بن جائیں گے۔

دعوت کے چند بنیادی اصول

ا۔ مخاطبین تک بات پہنچانے کے مواقع تلاش کرنا

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے موقع کی تلاش میں رہے جب لوگ اس کی دعوت کو سننے کے لیے متوجہ ہوں۔ مناسب موقع پر کی گئی بالکل عام اور سادہ سی بات بھی مخاطب پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے، جبکہ بے محل اور غیر مناسب وقت میں بہت علمی بات بھی کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ اسی طرح بعض مرتبہ حق بات غلط موقع پر بیان کی جائے تو دعوت کو فائدہ دینے کے بجائے نقصان پہنچا دیتی ہے۔ سمجھنے کے لیے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

سیدنا ابراہیم عَلَیہِ السّلام کی دعوت:

سیدنا ابراہیم عَلَیہِ السّلام نے اپنی قوم کو اس وقت دعوت دی جب ساری قوم آپ کی جانب متوجہ تھی۔ جب آپ عَلَیہِ السّلام نے بتوں کو توڑ دیا اور کافروں کے قائدین نے آپ کو سب کے سامنے لا کھڑا کیا، اور پوچھا کہ اے ابراہیم! ہمارے معبودوں کا یہ حال تم نے کیا ہے؟

سیدنا ابراہیم عَلَیہِ السّلام نے جواب دیا:

﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ﴾ (الأنبياء: 63)

”یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے، سو تم لوگ ان سے پوچھ لو! اگر یہ بول سکتے ہوں“

ایک داعی کے لیے ایسے سنہری موقع کبھی کبھی آتے ہیں جب اس کے تمام مخاطب پوری توجہ کے ساتھ اس کے ہونٹوں کی جنبش تک کو محسوس کر رہے ہوں، لہٰذا داعی ایسے وقت میں اپنی مکمل دعوت کو کس خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے، یہ اس داعی کی بصیرت اور توفیقِ الٰہی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت خلیل عَلَیہِ السّلام کا یہ مختصر جملہ مخالف کفار پر اس کلہاڑی کے وار سے زیادہ بھاری تھا جس سے آپ عَلَیہِ السّلام نے ان کے بتوں کو توڑا تھا۔ اس جملے نے صرف عوام میں ہی نہیں بلکہ ان کے قائدین میں بھی کھلبلی مچادی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی قوم کے سامنے اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے، جس کو عام حالات میں بھی کبھی تسلیم نہ کرتے۔ کہنے لگے:

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ﴾ (الأنبياء: 65)

”تم تو جانتے ہو کہ یہ بت بول نہیں سکتے“۔

﴿قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۔أُفٍّ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (الأنبياء: 66-67)

”ابراہیم عَلَیہِ السّلام نے فرمایا: تو کیا تم اللہ کے علاوہ اس کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں کوئی فائدہ دے سکتا ہے نہ نقصان، تف ہے تم پر اور تمہارے معبودوں پر! کیا تمہیں عقل بھی نہیں ہے“۔

فائدہ:

اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ داعی ایسے موقع کی تلاش میں رہے جب لوگ اس کی بات کو سننا چاہ رہے ہوں۔ ورنہ اگر اس نے ایسے موقع کو گنوادیا تو بقول شاعر:

؎ زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا   ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی دعوت:

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے فرعون کے دربار میں جب معجزہ دکھایا تو فرعون نے کہا کہ یہ تو جادو ہے، لہٰذا میں بھی تمہارے مقابلہ میں اپنے جادوگر لاؤں گا، کوئی وقت طے کرلو۔ سیدنا موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا:

﴿قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَنْ يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى﴾ (طهٰ: 59)

”فرمایا: تمہارے وعدے کا دن جشن کا دن ہے اور جب دن چڑھے لوگ جمع ہوں“۔

فائدہ:

سیدنا موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے اس موقع پر ایک بات کو ترجیح دی، وہ یہ کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جمع ہوں۔ اسی لیے آپ نے جشن کا دن چنا کیونکہ جشن کے دن ان کا میلہ ہوتا تھا اور اس دن بھی آپ نے ایسا وقت پسند کیا جب سب لوگ میلے میں آچکے ہوں، تاکہ سب کے سامنے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت ہوجائے۔ مقتدر طبقہ ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہے کہ حق کی دعوت کو عوام الناس تک نہ پہنچنے دیاجائے۔ لہٰذا داعی کو یہ سوچتے رہنا چاہئے کہ وہ اپنی بات عوام تک کس طرح پہنچائے۔

آج بھی دعوتی میدان میں سرگرم مجاہدین کو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہنا چاہیے جب وہ اپنی دعوت کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔

اسی کی ایک اور مثال حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کا واقعہ ہے جب آپ نے جیل میں موجود قیدیوں کو اس وقت دعوت دی جب قیدی آپ عَلَیْہِ السَّلَام سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آئے تھے۔

۲۔ مخاطب کے مزاج و نفسیات کو سمجھنا

کوئی بھی تحریک اگر اپنے مخاطب کے مزاج و نفسیات کو سمجھے بغیر ان سے خطاب کرے گی تو آئے دن دعوت میں ایسی غلطیاں سرزد ہوں گی جس سے مخاطب ان کے ساتھ ہونے کے بجائے ان کا مخالف ہوجائے گا، یا کم از کم ان کی دعوت کی جانب متوجہ نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ عالمِ عرب اور ہندستان و پاکستان کو ہی لے لیجئے، ان میں سے ہر خطے کے باشندوں کا مزاج دوسرے خطے والوں سے مختلف ہے۔ اگر آپ ہمیشہ ایک ہی انداز سے ان تمام خطوں کے

مسلمانوں کو اپنی بات سناتے جائیں گے تو یہ آپ کی دعوت کی جانب متوجہ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح نعروں اور ترغیبات کا انتخاب کرتے وقت اگر آپ نے اپنے ملک کے صرف ایک علاقے کی نفسیات کو اپنے سامنے رکھا اور اس دعوت ونعرے کو پورے ملک کے مسلمانوں کے لیے پیش کردیا تو وہ مخصوص خطہ تو ضرور آپ کی دعوت کی جانب متوجہ ہوجائے گا جس کی نفسیات کے مطابق آپ نے نعرے کا انتخاب کیا ہے، لیکن باقی خطے کے مسلمان اس جانب کان نہیں دھریں گے۔[1]

اسی طرح ایک جملہ کسی ایک علاقے کے لوگوں کے لیے بہت بامعنیٰ اور ان کو جھنجوڑنے والا ہوسکتا ہے، لیکن وہی جملہ کسی دوسرے علاقے والوں کے لیے یکسر بے معنیٰ ہوسکتا ہے، جسے سن کر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگے۔ اور کبھی ایک جملہ کسی علاقے والوں کے لیے اتنا برا اور منافیٔ حیاء نہیں ہوتا لیکن وہی جملہ دوسرے علاقے میں انتہائی برا اور شرم و حیا اور شرافت کے خلاف سمجھاجاتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس دعوتی اصول کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے واضح اعلان فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (إبراهيم: 4)

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر زبان بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ اپنی قوم کو واضح کرکے بیان کرے"۔

واضح کر کے بیان کرنے سے یہ مراد ہے کہ داعی اپنے مخاطب کو اتنے خوبصورت انداز میں اپنی دعوت سمجھائے کہ اس کا مخاطب آسانی سے اس پوری دعوت کو سمجھ جائے۔ خوبصورت انداز وہ ہوگا جو مخاطب کے مزاج ونفسیات کے مطابق ہوگا۔ کھول کر بیان کرنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لوگ اچھی طرح آپ کی تحریک سے واقف ہوجاتے ہیں، ان کواس کے نصب

---

[1] البتہ نعرے اور ترغیبات کا تعین کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ یہ نعرے اور ترغیبات شرعی حدود میں، شریعت ہی کے دنیاوی واخروی فضائل وبرکات سمیٹنے کے لئے ہوتے ہیں۔ نہ کہ جمہوری لوگوں کی طرح جو صرف دنیاوی مفادات وخواہشات کو سامنے رکھ کر اپنے نعروں اور وعدوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

العین اور مقصد سے آگاہی ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنے نعرے کو کھول کر نہیں سمجھایا تو مشکل ہے کہ لوگ آپ کی جانب متوجہ ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے دعوت میں ہمیشہ مخاطب کے مزاج کی رعایت کی اور مختصر اور دل میں گھر کر جانے والے انداز میں اپنے مخاطب کو دعوت دی۔ حج کے موسم میں جب آپ ﷺ مختلف قبیلوں کے پاس جا جاکر دعوت دیتے تو وہاں بھی اس بات کا خیال رکھتے کہ مخاطب کی نفسیات کے مطابق دعوت دیں، چنانچہ مدینہ سے آئے لوگوں کو دعوت دی تو انھوں نے پوچھا کہ آپ کس بات کی طرف ہمیں دعوت دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ کوئی طاقتور کسی کمزور پر ظلم نہ کرے، یتیموں اور مسکینوں کا خیال رکھا جائے، مہمانوں کی مہمان نوازی کی جائے اور مسافروں کو کھانا کھلایا جائے“۔

چونکہ اہلِ مدینہ اور باقی عرب میں بھی ان باتوں کو شرافت و عزت کی بات سمجھا جاتا ہے تو ان لوگوں پر ابتداء میں ہی اسلام کا وہ رخ پیش کیا گیا جو ان قبائل کے نزدیک بھی بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سردارانِ قریش کو دعوت دیتے وقت بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ کی دعوت روز بروز بڑھتی چلی گئی اور کفار کے مظالم، سختیوں اور مصائب کے باوجود صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اسلام پر ڈٹے رہے تو قریش کا مقتدر طبقہ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس آیا اور آپ ﷺ کی شکایت کی کہ تمہارے بھتیجے نے ہمارے دین میں عیب نکالاہے، ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا ہے اور یہ ہمیں بیوقوف وکم عقل قرار دیتا ہے، لہٰذا آپ اس کو سمجھایئے یا آپ ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جایئے۔

ابو طالب نے آپ ﷺ کو بلا بھیجا۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو ابو طالب نے کہا: ”بھتیجے تمہاری قوم تمہاری شکایت کرتی ہے اور ایسا ایسا کہتی ہے“۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”چچا جان! میں تو انھیں صرف ایک ایسے کلمے کا اقرار کرنے کا کہتا ہوں، کہ اگر یہ ایک بار اس کو مان لیں تو ان کو عرب وعجم کی سرداری مل جائے گی۔ یہ سنتے ہی سارے سردار بول اٹھے کہ ہمیں جلد بتاؤ ایسا کلمہ تو ہم دس بار پڑھنے کو تیار ہیں، جس سے ہمیں عرب و عجم کی سرداری مل جائے؟“[2]

---

[2] سیرۃ ابن ھشام، ج ۱، ص ۴۱۸

فائدہ:

آپ غور کیجئے کہ کہ آپ ﷺ نے سردارانِ قریش کے مزاج کا خیال کرتے ہوئے ایسی بات بیان فرمائی جو ان سرداروں کو فوراً اپنی جاب متوجہ کرنے والی تھی۔ چونکہ سردارانِ قریش کو آپ ﷺ کی دعوت سے اصل خطرہ ہی یہ تھا کہ اس دعوت سے ان کا اقتدار و سرداری خطرے میں پڑ جائے گی،چنانچہ آپ ﷺ نےان کے اس خدشے کا جواب دیا کہ تم صرف عرب کی سرداری کی فکر کرتے ہو، میں تو تمہیں ایسے کلمہ کی طرف بلارہاہوں جس کو مان کر تم صرف عرب کے نہیں بلکہ عجم کے بھی سردار اور حکمران بن جاؤگے۔

آپ ﷺ نے بحرین کے بادشاہ کو اسلام کی دعوت دی تو اس میں بھی آپ نے یہی تحریر فرمایا کہ یہ کلمہ پڑھ لو، تمہارا سارا علاقہ تمہارے ہی قبضے میں رہے گا[3]۔اگرچہ اس کلمہ کو پڑھنے سے اصل فائدہ تو آخرت کا ہے لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ اس دنیا میں سوچتا ہے کہ یہ نئ دعوت جو ہمارے سامنے پیش کی جارہی ہے اس میں ہمارے لیے کیا ہے؟

خود اللہ تعالیٰ، جو اس بات سے بے نیاز ہیں کہ کوئی ان کے دین کو مانے یا نہ مانے، آپ جل جلالہ بھی قرآن کریم میں جہاں اسلام کی دعوت قبول کرنے والوں کو جنت کی یقین دہانی کراتے ہیں، وہیں ان کی دنیا کے بارے میں بھی ان سے ایک اچھی اور امن و امان والی زندگی کا وعدہ فرماتے ہیں۔ عرب کے معاشرے کے لیے یہ دونوں باتیں انتہائی اہم تھیں۔ پہلی قحط و خشک سالی سے نجات اور دوسری ظلم و جبر کے ماحول سے نکال کر امن والی زندگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ۔الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ﴾(قریش: 3-4)

”سو ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، جس نے انھیں فاقوں میں کھانا دیا اور خوف سے امن عطا فرمایا“۔

نیزاللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (النحل: 112)

---

[3] عيون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير، ج ٢، ص ٣٣٣

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے علاقے کی مثال بیان فرمائی ہے جو بالکل امن وسکون سے تھا، وہاں معاشی خوشحالی تھی اور ہر طرح کے وسائل ان کو میسر تھے، لیکن پھر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کرکے اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکری کی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس علاقے والوں سے یہ نعمتیں چھین لیں اور ان کے وسائل ختم فرما کر ان پر قحط مسلط کر دیا اور امن کی نعمت چھین کر ان کو خوف میں مبتلا کر دیا۔

یہ حقیقت بھی نگاہوں میں رہنا اہم ہے کہ انسانی مزاج میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یہ اس وقت تک کسی چیز کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتا یا اس جانب اچھی طرح متوجہ نہیں ہوتا جب تک اس کے سامنے اس غائب اور ان دیکھی چیز کی منظر کشی نہ کردی جائے۔ چنانچہ بے نیاز رب نے بھی اس انسانی مزاج کا خیال رکھا اور اپنی جنت کی طرف دعوت دیتے ہوئے اس انداز میں جنت کی منظر کشی کی کہ سننے والا اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ ہم قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہوئے جب ان آیات پر پہنچتے ہیں جن میں جنت کے باغات اور نہروں کا تذکرہ ہوتا ہے، عمدہ ترین لباس زیبِ تن کیے، ہاتھوں میں جام لیے، مسہریوں پر ٹیک لگائے جنتی لوگوں اور ان کے اردگرد سفید موتی کی مانند اور لعل ویاقوت کی طرح گھومتے پھرتے حور وغلمان کے مناظر نظر آتے ہیں تو دل بے اختیار رب کی جنت کا مشتاق ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ نے جہنم سے ڈرایا تو اس کے بارے میں بھی تفصیلی منظر کشی کی ہے تاکہ انسان کے دل میں جنت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور جہنم کا خوف اس کے شعور ولاشعور میں بیٹھ جائے۔

نیز ہم دیکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دجال کا بیان فرمایا تو نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا اندازِ بیاں ایسا تھا کہ ہمیں یوں لگنے لگا جیسے ان کھجوروں کے باغ سے ابھی دجال نکلنے والا ہے۔[4]

رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء رضی اللہ عنہم نے بھی اس انسانی مزاج کا خیال رکھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہمارے سامنے

---

[4] الصحيح لمسلم؛ كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذكر الدجال وصفته وما معه

انسان کی پیدائش کا بیان فرماتے تو اس انداز میں بیان فرماتے کہ ہمیں اپنے آپ سے گھن آنے لگتی۔ فرماتے کہ انسان دو مرتبہ پیشاب کی جگہ سے نکلا ہے۔

لہٰذا خلافت کی دعوت دینے والوں کو اس انسانی مزاج کا خیال رکھنا ہو گا۔ آج جو نئی دعوت آپ دے رہے ہیں، اسے اس انداز میں کھول کھول کر بیان کیجئے کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ خلافت قائم ہونے کی صورت میں عام مسلمان کو آخرت سے پہلے خود اس دنیا میں کیا کیا ملے گا؟ اس میں تاجروں کے لیے کیا کشش ہے؟ کسان کیوں آپ کا ساتھ دے؟ ایک مزدور مفلوک الحال مسلمان کیونکر آپ کی تحریک کا حصہ بنے؟ ظلم، نا انصافی، مہنگائی اور کرپشن کی ماری یہ قوم کس بنیاد پر آپ کی دعوت کی طرف متوجہ ہو؟ کیا صرف اس لیے کہ آپ کی دعوت حق کی دعوت ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! اگر انسانوں کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس دعوت کو الفاظ اور جملے بدل بدل کر جگہ جگہ مختلف انداز سے، مختلف پیرایوں میں نہ بیان فرماتے، بس اتنا ہی اعلان کردیا جاتا کہ یہ حق کی دعوت ہے جومان لے اس کو جنت ملے گی اور جو نہ مانے اس کو جہنم۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ ہماری دعوت پر صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ عام کافر بھی توجہ دے کہ یہ لوگ جس بات کا نعرہ لگارہے ہیں کہ ظلم کے بجائے انصاف، خوف کو ختم کرکے امن، مقتدر قوتوں کے ہاتھوں ذلت کے بجائے انسانی احترام، سرمایہ دارانہ استحصال سے نجات، عورتوں کو بازاری کھلونا بنانےکے بجائے گھروں کی شہزادی اور ملکہ بنانا ...... یہ سب نعرے سن کر کافر بھی پکار اٹھے کہ یہ سب تو میری بھی ضرورت ہے۔

۳۔ ہر سوال کا جواب دینا خطرناک ہے

کوئی بھی تحریک جب اپنی دعوت کی ابتدا کرتی ہے تو اس کے داعیوں میں جوش و ولولہ ہونا ایک فطری بات ہے، چنانچہ داعی اور کارکن حق کو بیان کرنے میں کسی کی ملامت کی پروا نہیں کرتے، لیکن تحریک کے ذمہ داران کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس خوبی کی قدر کرنے کے ساتھ ساتھ، اپنے داعیوں اور کارکنوں کو یہ بات سمجھائیں کہ حق بات کو ہر جگہ اور ہر وقت بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ بعض اوقات خاموش رہنا ہی تحریک کے مفاد میں ہوتا ہے۔ آپ کی دعوت کے مخالفین آپ کو ایسے سوالات میں الجھانا چاہیں گے جن میں زبان کھولنا یا دو ٹوک جواب دینا

آپ کی تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ قرآن وسنت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ ایسے مواقع پہ جواب دینے سے سلیقے سے پہلو تہی کی جائے۔

ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ عتبہ بن ربیعہ نے آپ ﷺ سے پوچھا: "تم بہتر ہو یا عبدالمطلب"؟ اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ تم سے بہتر تھے تو وہ بھی انہی بتوں کی عبادت کرتے تھے جن کی تم برائیاں کرتے ہو ،اور اگر تمہارا خیال ہے کہ تم ان سے بہتر ہو تو تم بولو، ہم سنتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ "فسکت رسول الله ﷺ"، یعنی "رسول اللہ ﷺ خاموش رہے"۔[5]

یہ ایک خطرناک سوال تھا جو عرب کے ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار بوڑھے نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ایسا وقت کسی بھی داعی کے لیے، خصوصاً دعوت کے ابتدائی مراحل میں، بہت خطرناک ہوتا ہے۔ذرا سی جلدبازی، جذباتیت اور شریعت کے مزاج سے ناواقفیت اس کی دعوت کو ابتدا ہی میں سبوتاژ کرسکتی ہے۔ آپ سوچیے اگر رسول اللہ ﷺ اس سوال کا واضح جواب دے دیتے اور فرما دیتے کہ میں عبد المطلب سے بہتر ہوں تو اس ابتدائی مرحلے میں آپ کے اپنے خاندان کے وہ لوگ ہی آپ کے مخالف ہوجاتے جو اس وقت آپ کی پشت پر کھڑے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے کفار آپ کو نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کر رہے تھے۔ عبدالمطلب قریش کی ایک نامور شخصیت تھیں، سو اگر ایک نوجوان ایسی شخصیت ہی کو غلط کہہ دیتا جس کی بزرگی پہ سب متفق تھے، تو ابتداء میں آپ ﷺ کو وہ حمایت بھی نہ ملتی جو اس وقت آپ کے خاندان میں آپ کو مل رہی تھی۔ لیکن آپ ﷺ اللہ کے رسول تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ پھر عتبہ نے آگے بات شروع کی۔

ایسا ہی سوال فرعون نے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں کھڑے ہوکر اس کو اور اس کے حکمران طبقے کو دعوت دی، فرعون نے پوچھا:

﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ﴾ (طه: 51)

---

[5] مصنف ابن أبي شيبة؛ باب في أذى قريش للنبي ﷺ

”(فرعون نے) کہا: (موسیٰ! تم جو یہ دعوت دیتے ہو کہ ہمارا رب اللہ ہے اور جو اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتے ہیں وہ گمراہ ہیں اور جہنم میں جائیں گے) تو پہلے لوگ (جو اسی ہمارے دین پر تھے) ان کا کیا ہوا؟(کیاوہ جہنم میں ہیں؟)“

سیدناموسیٰ عَلَیہِ السّلام نے جواب دیا:

﴿قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى﴾ (طهٰ: 52)

”فرمایا: اس بات کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں محفوظ ہے، میرا رب نہ (کسی کے فیصلہ میں) غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے“۔

حالانکہ سیدنا موسیٰ عَلَیہِ السّلام جیسے جرأت والے نبی کے لیے اس کا واضح جواب دینا کیا مشکل تھا، لیکن چونکہ اس واضح جواب سے دعوت کو نقصان پہنچتا اور لوگ پہلے ہی مرحلے میں آپ کی دعوت سے متنفر ہوجاتے، لہٰذا اس کا مبہم جواب دے دیا۔ اور پھر آگے دوبارہ اپنی دعوت دینی شروع کردی کہ میرا رب وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا۔

چونکہ آپ عَلَیہِ السّلام ابھی اپنی دعوت کے ابتدائی مراحل میں تھے اور دعوت کو مکمل طور پر کھول کر بیان نہیں کرسکے تھے، لوگوں نے آپ کی دعوت کو ابھی پوری طرح قبول نہیں کیا تھا بلکہ ابھی ٹھیک سے سنا بھی نہیں تھا ...... اس لیے اگر آپ اسی مرحلہ میں ان کے باپ دادا کو مرتد اور کافر قرار دےدیتے تو یہ جملہ صرف ہوا کا بلبلہ نہ ہوتا بلکہ انتہائی بھاری اور ناقابلِ برداشت جملہ ہوتا۔

البتہ جب دعوت عام ہوجائے اور لوگ دعوت کو قبول کرلیں تو پھر انہیں ان کے باپ دادا کا حکم بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ کفر سے نفرت ان کے دل میں اس قدر بیٹھ جاتی ہے کہ کسی حال میں اس کفر کو برداشت کرنے پہ تیار نہیں ہوتے، خواہ وہ ان کے باپ دادا میں ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو۔

چنانچہ داعی کی تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس کو معلوم ہو کہ کب زبان کھولنی ہے اور کب بالکل بند رکھنی ہے۔ کس بات کا جواب دینا چاہیے اور کس جگہ صاف بچ نکلنا چاہیے۔ مخالف قوتیں کس طرح پھنسانے کی کوشش کرتی ہیں اور اس سے بچ نکلنے کے راستے کیا ہوتے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے ہر دور میں دعوت کی ان باریکیوں کا خیال رکھا ہے۔ مثلاً مشاجراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں اگر کوئی امام احمد رحمہ اللہ سے سوال کرتا تو فرماتے ”تلک

أمة قد خلت۔۔۔" کہ "وہ ایک امت تھی جو گزر گئی ،ان کے اعمال ان کے لیے ہیں اور تمہارے تمہارے لیے"۔[6]

اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ سے کوئی صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں زیادہ سوال کرتا تو فرماتے کہ: اس پر ایمان واجب ہے اور اس کے بارے میں زیادہ سوال کرنے والا بدعتی ہے[7]۔

یہ تمام بحث یہ بتارہی ہے کہ داعی کو دعوت میں ان تمام باتوں کا ضرور خیال رکھنا چاہئے جو اس کی دعوت کو نقصان پہنچانے کا سبب بن سکتی ہوں۔ جس بات کی اور جن اصولوں کی دعوت دی جاتی ہے ان پر کوئی کمزوری نہیں دکھائی جانی چاہیے، البتہ الفاظ اور انداز بیان موقع کی مناسبت سے اختیار کیا جانا چاہیے۔چنانچہ فرعون جیسے ظالم کو دعوت دینے کے لیے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تو فرمایا:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى ﴾ (طه: 44)

"تم دونوں اس(فرعون)سے نرم بات کہنا تاکہ وہ نصیحت پکڑے اور ڈر جائے"۔

وضاحت:

اگرچہ بعض انبیاء نے کفار کے سوالات کے دوٹوک جواب بھی دیے ہیں، مثلاً سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا فرمانا کہ:

﴿قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (الأنبياء: 54)

"فرمایا: بلاشبہ تم اور تمہارے آباءواجداد کھلی گمراہی میں ہو"۔

لیکن ایسے جوابات بھی موقع کی مناسبت سے دیے گئے ہیں، جب یہی اسلوب اختیار کرنا اور دوٹوک بات کہنا حکمت کا تقاضہ تھا۔

۴۔موقع کی مناسبت سے گفتگو کرنا

جب کفارِ مکہ نے مسلمانوں پر مظالم ڈھانے شروع کیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر صحابہ کی ایک جماعت حبشہ (ایتھوپیا) ہجرت کرکے چلی گئی۔ حبشہ کا بادشاہ ایک عادل عیسائی تھا، جن

[6] البداية والنهاية؛ ج۸، ص ۱۳۹

[7] شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة للالكائي

کو 'نجاشی' کہاجاتا تھا۔ جب کفارِ مکہ کو اس بات کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنا ایک وفد نجاشی کے دربار میں بھیجا کہ وہ نجاشی سے بات کرکے ان کے باغیوں کو حبشہ سے نکالنے پر مجبور کردے۔ چنانچہ اس وفد نے حبشہ پہنچ کر نجاشی کو کہا کہ ہمارے کچھ باغی ...... جنھوں نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے اور بھائی کو بھائی سے لڑایا ہے...... انھوں نے تمہارے ملک میں آکر پناہ لی ہے، آپ انھیں ہمارے حوالے کردیجیے یا ان کو اپنے یہاں سے نکال دیجیے۔

یہ سن کر نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلا بھیجا۔ مسلمانوں کو جب اس معاملہ کی اطلاع ہوئی تو سب بہت پریشان ہوئے کہ اگر ہمیں کفارِ مکہ کے حوالے کردیا گیا تو ہمارے اوپر تو پہلے سے بھی زیادہ مظالم ڈھائے جائیں گے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی ان مہاجرین میں موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ پریشان نہ ہو اور جیسا میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ آپ نے فرمایا کہ جب نجاشی کوئی سوال کرے تو کوئی مسلمان نہ بولے صرف میں بولوں گا۔

مسلمان نجاشی کے دربار میں پہنچے تو نجاشی نے کفارِ مکہ کی بات دہرائی کہ یہ وفد سردارانِ قریش کی طرف سے آیا ہے اور تم لوگوں کے بارے میں ایسا ایسا کہتا ہے؟ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: اے بادشاہ! ہم جاہل و گنوار تھے، نہ کسی رشتہ کا پاس تھا نہ کسی تعلق کا خیال، شرک و بت پرستی اور گمراہی میں مبتلا تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا، ہماری ہدایت کے لیے ہم ہی میں سے اپنا رسول بنا کر ایک ایسے شخص کو بھیجا جس کے حسب ونسب اور خاندانی شرافت کی گواہی سارا عرب دیتا ہے۔اس نوجوان نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، اس نے ہمیں آکر بتایا کہ اللہ کون ہے، دین کیا ہے۔

تقریر کے بعد نجاشی نے پوچھا کہ جو قرآن تمہارے نبی کو دے کر بھیجا گیا ہے اس میں سے ہمیں بھی کچھ سناؤ۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جو آیات تلاوت فرمائیں، وہ اہلِ مجلس کے مزاج کے مطابق تھیں اور ان پر اثر ڈالنے والی تھیں۔ چونکہ یہ لوگ عیسائی تھے، اس لیے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں، جن کو سن کر نجاشی آنسوؤں سے رونے لگے اور مسلمانو ں کو کافروں کے حوالے کرنے سے انکار کردیا۔

کفارِ مکہ نے جب یہ دیکھا تو انھوں نے مکاری سے کام لیتے ہوئے دوسرے انداز میں نجاشی کے کان بھرے اور کہا کہ یہ مسلمان تو اپنے علاوہ سب کو غلط کہتے ہیں، آپ ان سے اپنے

بارے میں پوچھیے۔ دوسرے دن نجاشی نے پھر ان حضرات کو بلوایا اور پوچھا کہ آپ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

مسلمانوں کے لیے یہ مرحلہ انتہائی دشوار تھا، نہ تو حق کو چھپایا جاسکتا تھا اور نہ ہی اس کو اس انداز میں بیان کیا جاسکتا تھا جس سے مسلمانوں کے لیے اس زمین پر رہنا مشکل ہوجائے۔ چنانچہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم ان کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے، وہ یہ کہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اللہ کے بندے، اس کے رسول ہیں، اس کی روح اور کلمہ ہیں جو اس نے کنواری پاکباز مریم پر القاء کیا۔

یہ سن کر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ: "خدا کی قسم! جو کچھ تم نے بیان کیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ بیان نہیں کیا"۔

اس کے بعد نجاشی نے قریش کے نمائندوں کو دو ٹوک انداز میں جواب دے دیا کہ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔

فائدہ:

نجاشی کے سوال کے جواب میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے ایسا جواب دیا جو قرآن سے تھا، لیکن انجیل میں بھی وہی مذکور تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس نازک مرحلے پر نہ تو حق کو چھپایا، نہ ہی ایسا اشتعال انگیز جواب دیا جسے سن کر نجاشی اور اہلِ حبشہ مسلمانوں کے مخالف ہوجائیں اور ان کو کفار مکہ کے حوالے کردیں۔ نیز اس واقعہ سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایسے مواقع پر کسی ایسے بولنے والے کا انتخاب کرنا چاہیے جو اچھے انداز میں اجتماعی موقف کو پیش کرے اور مجلس وموقع کی نزاکت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گفتگو کرے۔

۵۔حالات کے مختلف ہونے سے حکم کا مختلف ہونا

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات اور ماحول کی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے شرعی حدود کے اندر رہتے رہتے اپنی دعوت کے انداز میں بھی تبدیلی پیدا کرے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک بستی میں لوگوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن اس مسجد کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا: یا رسول اللہ! ہم کھیتی باڑی کرنے والے لوگ ہیں، دن بھر کے تھکے ہارے شام کو گھروں کو لوٹتے ہیں، معاذ رضی اللہ عنہ عشاء کی

نماز لمبی پڑھاتے ہیں، جو ہم پر بہت مشکل ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: "أفتّان أنت یا معاذ"؟ "اے معاذ! تم لوگوں کو فتنے میں ڈالنا چاہتے ہو؟"[8]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جہاں نماز پڑھاتے تھے، وہاں کی مخصوص صورتِ حال اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ نماز کو مختصر پڑھایا جائے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے وہاں کے حالات کا خیال کرتے ہوئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو مختصر نماز پڑھانے کا حکم فرمایا، حالانکہ عام حالات میں نماز کو لمبا پڑھانا اچھی بات ہے۔

٦۔ مخالفین کی بات کو بھی بغور سننا

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہجرتِ مدینہ سے قبل جب 'عتبہ' قریش کا نمائندہ بن کر آیا تو آپ ﷺ نے اس کی بات کو پوری طرح سنا، یہاں تک کہ جب وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا تو اس کے بعد آپ ﷺ نے مختصراً اپنی گفتگو فرمائی۔[9]

٧۔ مخصوص اہم افراد پر محنت کرنا

نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ معاشرے کہ ایسے مؤثر افراد جن کا تعاون آپ کی تحریک کو زیادہ مضبوط کر سکتا ہے، ان پر خصوصی محنت کرنی چاہیے، نیز ان کے لیے دعا اور انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام الانبیاء ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابو جہل) میں سے کوئی ایک ہمیں عطا فرما دے[10]۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کو دے دیے گئے جس سے اسلام مضبوط ہوا اور مکہ میں کھلے عام دین کی دعوت دی جانے لگی۔

---

[8] متفق علیہ

[9] سيرة ابن هشام؛ باب قول عتبة ابن ربيعة في أمر رسول الله ﷺ

[10] سنن الترمذي، كتاب المناقب، باب في مناقب عمر بن الخطاب رضي الله عنه

۸۔عام دعوت اور خاص دعوت میں فرق کرنا

عام دعوت کا مواد خاص دعوت کے مواد سے مختلف ہونا چاہیے۔ عام دعوت میں (یعنی عوام کو دعوت دینے میں) گفتگو انتہائی محتاط اور نپی تلی ہوتی ہے، جس میں مخاطبین کے تمام طبقات کا خیال رکھاجاتا ہے۔ اس دعوت میں ان نکات کو زیادہ بیان کیا جانا چاہیے جو آپ کے اور آپ کے مخاطبین کے مابین مشترک ہوں۔

اس کے برخلاف خاص دعوت میں آپ کھل کر بات کرسکتے ہیں اور مخصوص مخاطبین کی مخصوص ذہنیت اور مزاج کے مطابق تفصیل سے بات رکھی جاسکتی ہے۔

۹۔موزوں جملوں اور مناسب الفاظ کا انتخاب کرنا

دعوت میں اچھے جملے اور مناسب الفاظ آپ کی دعوت کو چار چاند لگاسکتے ہیں۔ اور انھی میں بے احتیاطی آپ کی دعوت کو غیر مؤثر بناسکتی ہے۔ قرآن کریم کا تو یہ معجزہ ہے کہ اس کی آیات، اس کے الفاظ اوران کی ترتیب اتنی جامع اور مکمل ہے کہ انسان اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "أوتيت جوامع الكلم" کہ "مجھے جامع کلمات عطاکیے گئے ہیں"۔

ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے شیخ اسامہ رحمہ اللہ کو گویا دعوت کا نبوی طریقہ الہام فرمایا۔ شیخؒ کے بیانات دیکھیے توایسا لگتا ہے کہ ایک ایک موضوع، ایک ایک جملہ اور ہر ہر لفظ آپ کی زبان پر جاری کرادیا گیا ہو۔ جس طبقے کو بھی خطاب کیا مکمل کیا۔ عام فہم، دل ودماغ کو متوجہ کرنے والا، عقلی دلائل سے آراستہ، جس کو ہر ایک تسلیم کرسکتا ہے۔

شیخ اسامہ رحمہ اللہ نے اہلِ یورپ سے ایک بار خطاب کرتے ہوئے ان کو یہ سمجھایا کہ تم لوگ یہودیوں کے غلام ہو۔ لیکن شیخؒ نے اس خطاب میں 'یہود' کے بجائے 'ملٹی نیشنل کمپنیوں' کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ یورپ میں اگر یہود کے خلاف براہِ راست بات کی جاتی ہے تو اس کو 'سامی نسل کی مخالفت' (Anti semitism) کہہ کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ لہٰذا شیخ نے ایک ایسے لفظ کے استعمال سے گریز فرمایا جو ان کی پوری محنت کو رائیگاں کردیتا اور اس کے مقابلہ میں اس کا متبادل لفظ استعمال فرمایا جس سے ان کی دعوت میں چار چاند لگ گئے، کیونکہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ظلم کی چکی میں پستی یورپی عوام کے لیے اس تقریر میں بڑی کشش

تھی بلکہ یہ ان کے جذبات کی ٹھیک ترجمانی کر رہی تھی۔ بی بی سی نے اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ تقریر انتہائی مہارت سے لکھی گئی ہے۔

۱۰۔ان بحثوں سے دامن کو بچانا جو دعوت میں رکاوٹ بن جائیں

احیائے خلافت کے دشمن آپ کو ایسی بحثوں میں الجھانا چاہیں گے جس میں الجھ کر آپ اپنے مقصد سے ہٹ جائیں اور کہیں اور ہی الجھ کر رہ جائیں، مثلاً اختلافی نظریاتی بحثیں اور مسلکی اختلافات وغیرہ۔ اگر آپ ایک بار ان مسائل میں الجھ گئے تو پھر آپ کو احیائے خلافت سے زیادہ اہم یہی مسائل نظر آئیں گے، یوں آپ اور آپ کی تحریک اپنے نصب العین سے ہٹ کر کہیں اور ہی جا پڑے گی۔ لہٰذا ہمیشہ ان بحثوں سے بچنا ہے جو آپ کی دعوت کا رخ کسی اور جانب موڑ دیں۔ بالخصوص ذمہ داران پر لازم ہے کہ وہ سختی سے اپنے افراد کو ایسے موضوعات چھیڑنے یا ایسی بحثوں میں اترنے سے روکیں۔

داعیوں کو چاہیے کہ وہ دعوت دیتے وقت اس دکاندار کی طرح ہوجائیں جو اپنا سودا بیچتے وقت اپنے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں رکھتا کہ کسی طرح اپنا سودا گاہک کو بیچ دے۔ وہ اپنے سودے کو گاہک کے سامنے اس انداز میں پیش کرتا ہے گویا یہ سامان بنا ہی اس گاہک کے لیے ہے، اور اس گاہک سے زیادہ اس سودے کا حق دار دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا سمجھدار دکاندار آپ سے کسی اور بحث میں نہیں الجھے گا، آپ کی باتوں کو غور سے سنے گا، آپ کی موافقت کرے گا، مگر گھوم پھر کر واپس اپنے سودے کی تعریف و توصیف بیان کرنا شروع کردے گا۔

۱۱۔بحث میں مدلل جواب کے بجائے الزامی جواب دینا

بعض مرتبہ داعی کو اپنے مخالفین کے جواب دینا ناگزیر ہوجاتا ہے، مگر بحث کے دوران ایسا موقع اور اتنا وقت میسر نہیں ہوتا کہ تفصیلی دلائل سمجھائے جاسکیں۔ چنانچہ اس مختصر وقت میں اس کو مدلل جواب دینے کے بجائے الزامی جواب دینا بہتر ہوتا ہے، یعنی جو باتیں وہ آپ کی تحریک کے بارے میں کہہ رہا ہے، اس کے رد میں آپ اس کو آئینہ دکھا کر اس کا منہ بند کردیں۔ قرآن کریم میں اس کی مثالیں جابجا موجود ہیں۔ مثلاً یہود کی بابت فرمایا:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا...﴾ (البقرۃ: 91)

”جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے، اس پر ایمان لے آؤ۔ کہتے ہیں: ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے“۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے انھیں قرآن کے سچا ہونے پر دلائل نہیں دیے، بلکہ یہ کہتے ہوئے ان کا منہ بند کر دیا:

﴿فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ ...﴾ (البقرة: 91)

”تو پھر تم (اپنے) انبیاء کو قتل کیوں کرتے رہے ہو“۔

اسی طرح یہود کہتے تھے کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرما دیا کہ محبوب تو اپنے حبیب سے ملاقات کی تمنا کرتے ہیں، سو تم بھی موت کی تمنا کرو اگر تم واقعی سچے ہو۔

آپ کے پاس اگر وقت کم ہے اور اعتراض کرنے والے کا مقصد اصلاح نہیں بلکہ صرف تنقید ہے تو اس کے ساتھ بحث میں الجھنا اور علمی دلائل دینا آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے وقت میں الٹے اس پر اعتراض جڑ کر اس کو دفاعی پوزیشن پر لائیں اور اس سے پوچھیں کہ تم کس منہ سے اعتراض کرتے ہو جبکہ تمہارا اپنا کردار ایسا اور ایسا ہے!

رسول اللہ ﷺ نے تاریخِ اسلام کا پہلا سریہ مکہ کی جانب روانہ کیا، حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو اس کا امیر بنایا۔ اس سریہ میں صحابہ ؓ سے ایک کافر مارا گیا۔ یہ واقعہ حرمت والے مہینہ میں واقعہ ہوا۔ صحابہ ؓ سمجھ رہے تھے کہ ابھی حرمت والا مہینہ شروع نہیں ہوا ہے۔ اس وقت تک حرمت والے چار مہینوں (رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم) میں قتال کی اجازت نہیں تھی۔ کفارِ مکہ نے آسمان سر پر اٹھالیا اور کہنے لگے کہ دیکھو محمد (ﷺ) کے ساتھی تو اب ان محترم مہینوں کا بھی احترام نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے خود ان کفار کو جواب دیا کہ: تم جو ایک قتل پر اتنا شور مچاتے ہو اور یکا یک اخلاق و شرافت کی بات کرنے لگے ہو، تم خود اپنے دامن میں تو جھانک کر دیکھو کہ تم تو وہ ہو جنھوں نے خود بھی اللہ کو ماننے سے انکار کیا اور دوسروں کو بھی اللہ کے راستے سے روکا۔ تمہاری شرافت کا تو یہ عالم ہے کہ تم نے مسلمانوں کو مسجدِ حرام جیسی مقدس جگہ سے روک دیا اور ان کو ان کے علاقے مکہ سے نکال دیا جو کہ یقیناً کسی بھی شریف انسان کے لیے انتہائی عار کی بات ہے۔ لہٰذا تمہارا کفر اور تمہارے یہ کرتوت فتنہ ہیں اور قتل کے مقابلے میں فتنہ زیادہ برا ہے۔

کفار کے ایک اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی اتنی برائیاں بیان فرمائیں کہ ان کو خاموش ہونا پڑا۔ اس واقعے میں اہلِ ایمان کے لیے یہ سبق موجود ہے کہ جب کفار مسلمانوں پر اعتراض کریں، تو اہلِ ایمان کو ان کے ساتھ مل کر انہی کی سی بولی نہیں بولنی چاہیے بلکہ ایسے وقت میں مسلمانوں کا دفاع کرنا چاہیے۔ البتہ جہاں تک ایک دوسرے کی اصلاح کی بات ہے تو وہ اندرونی طور پہ ضرور کی جانی چاہیے۔ ہاں کسی مسلمان کو کھلے عام کافروں اور زندیق قادیانیوں کے ساتھ مل کر جہاد و مجاہدین پر اعتراض نہیں کرنے چاہئیں۔ جو بھی ایسا کرتا ہے وہ قادیانی کی روح کو خوش کرتا ہے اور محمد ﷺ اور ان کے رب کو تکلیف پہنچاتا ہے۔

۱۲۔ عزمِ مصمم سے دعوت دینا

میدانِ دعوت میں جن احتیاطوں کا اوپر ذکر کیا گیا اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ دعوت میں کمزوری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے جرأت و استقامت کے ساتھ دعوت کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ کفارِ مکہ کا دوسرا وفد جب ابو طالب کے پاس آیا اور دعوت کو نہ روکنے کی صورت میں جنگ کی دھمکی دے گیا، تو چچا نے آپ ﷺ کو بلایا اور صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلایا، جس کو سن کر امامِ انسانیت، رحمۃ للعالمین ﷺ نے یہ الفاظ فرمائے:

"اے چچا! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں تاکہ میں اس دعوت کو چھوڑ دوں تو بھی میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا، یا تو اللہ اس دین کو غالب کرے گا یا میں نہ رہوں گا اور قتل کر دیا جاؤں گا"۔[11]

۱۳۔ آزمائشوں کا ثابت قدمی سے سامنا کرنا

دین کی دعوت اور آزمائشیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ کونسا داعی افضل ہے؟ کیا وہ جس کو ابتدا ہی میں غلبہ حاصل ہو گیا، یا وہ جس کو مصائب و پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد اس کو غلبہ حاصل ہوا؟ امام صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا:

---

[11] سيرة ابن هشام؛ باب طلب أبي طالب إلى رسول اللهﷺ الكف عن الدعوة وجوابه له

"لا یمکن حتیٰ یبتلی، واللّٰہ تعالیٰ ابتلی أولی العزم من الرسل فلما صبروا مکنھم"۔

"آزمائشیں آئے بغیر غلبہ حاصل ہونا ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولو العزم انبیاء کو آزمائشوں میں مبتلا فرمایا، سو جب انھوں نے (ان اذیتوں پر) ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو غلبہ عطا فرمایا"۔[12]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ ابراہیم کے پاس نماز ادا کر رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط اٹھ کر آپ کے پاس آیا اور آپ کی چادر کو آپ کے گلے میں لپیٹا اور اتنی سختی سے کھینچا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ لوگ چیخ و پکار کرنے لگے، ان کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قتل کردیے گئے، اچانک ابو بکر رضی اللہ عنہ غصے سے بھرے ہوئے آئے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور کفار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: "کیا تم ایک آدمی کو صرف اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے"۔ اس کے بعد لوگ آپ سے الگ ہوگئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ نماز میں مشغول ہوگئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے سرداروں کے قریب سے گزرے، جو بیت اللہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے اور فرمایا:

"اے گروہ قریش! قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے ،مجھے تمہاری طرف (تمھیں) ذبح کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کی طرف اشارہ کیا"۔[13]

یہی بدبخت عقبہ بن ابی معیط تھا ،جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی تھی جب آپ حرم میں سجدے کی حالت میں تھے۔حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا اس وقت چار پانچ سال کی تھیں۔وہ دوڑی ہوئی آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر سے اوجھڑی ہٹادی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا:

﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (ال عمران: 184)

---

[12] السیرة الحلبیة، ج:١ ص :٢٨١

[13] مصنف ابن أبي شيبة، وفتح الباري باب ما لقي النبي ﷺ وأصحابه من المشركين بمكة

"سو اگر وہ آپ کو جھٹلادیں تو آپ سے پہلے والے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا ہے"۔

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (ال عمران: 186)

"تمہیں تمہاری جانوں اور مالوں کے بارے میں ضرور آزمایا جائے گا، اور تمہیں اہلِ کتاب اور مشرکین کی جانب سے زیادہ تکلیف دہ باتیں ضرور سننا پڑیں گی، اور اگر تم (ان تکالیف اور سخت باتوں کے مقابلے) ڈٹے رہے، اور تقویٰ اختیار کئے رہے تو یہ پختہ کاری میں سے ہے"۔

تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جانثار صحابہ نے اس دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے اپنے جسموں کو لہولہان کرایا، دہکتے انگاروں کو اپنے جسم کی چربی سے ٹھنڈا کیا، اسلامی نظام کو غالب کرنے کے لیے اپنے گھر بار کو چھوڑا، آپ ﷺ اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم قتال فی سبیل اللہ کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے اپنے دین کو غالب کردیا۔

آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ خلافت کے قیام کی دعوت دینے والے افراد، رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اختیار کرتے ہوئے، دعوت و قتال کو ساتھ لے کر چلیں، دن رات ایک کریں اور اسی راستے میں اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کردیں، کہ جہاد کے راستے میں شہادت کے پیچھے دوڑنا اور اس کو پالینا بہت بڑی کامیابی ہے۔

اختتامیہ

اللہ کے بندوں کو انسانوں کے بنائے نظاموں کی عبادت سے نکال کر اللہ کے نظام کی طرف بلانا، واقعی سخت مشکل بھرا کام ہے، لیکن تمام انبیاء علیہم السلام نے اسی مقصد کے لیے مشکلات و تکالیف برداشت کیں، سو آج اسی مقصد کے لیے اگر مجاہدین کو قربانی دینی پڑ رہی ہے، آزمائشوں اور مشکلات نے آگھیرا ہے، تو یہ اللہ کی سنت ہے۔ لیکن اس سب کے بدلے اگر ہمارا رب ہم سے راضی ہوجائے تو یہ مشکلات سہنا کوئی مہنگا سودا نہیں۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی امت مکمل ہدایت پر آجائے، اللہ کے مقابل کھڑے کیے گئے نظاموں سے برأت کا اعلان کرکے خلافت کے قیام کی طرف آجائے، اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت نافذ کرنے پر تیار ہوجائے، اللہ اور رسول ﷺ کے دشمنوں سے قتال کے لیے اٹھ کھڑی ہو تو یہ ہجرتیں، یہ جدائیاں، یہ زخم .... جو ڈرون کے میزائلوں نے لگائے، یا دشمن کے ظلم و جبر نے .... اور وہ زخمِ

دل جو اپنوں کی زبان و قلم نے تحفے میں دیئے .... سب خوشی خوشی قبول ہیں .... کہ پھول دار پودے کی نشوونما کی خاطر باغبان کو کانٹے چبھتے ہی رہتے ہیں ...... داعیوں کو دشمنوں کی اچھالی کیچڑ کی کیونکر پروا ہو ...... کہ کنول کا پھول حاصل کرنے کی جستجو میں کیچڑ تو لگ ہی جایا کرتی ہے۔ اگر اپنی ذات کی قربانی دے کر دوسروں کو سکون وراحت پہنچانے کی سنت اس دنیا میں نہ رہے تو پھر ماں ماں کیسے کہلاسکتی کہ دوسروں کے لیے اپنے آپ کو مٹادیتی ہے!!

سو جہاد وخلافت کی دعوت دینے والوں کو بھی اس دعوت کے لیے خود کو مٹادینا چاہیے ...... اپنے آج کو امت کے مستقبل پر ...... اوراپنی بے خوابی کو امت کی نیند کے لیے۔ اگر محمد ﷺ کے غلاموں کے گھر بچانے کے لیے اپنے گھر اجڑ گئے تو کیا ہوا ...... رحمۃ لعالمین کی امت کی آسودگی کی خاطر خود فقر وفاقے سہنے بھی پڑیں تو کیا غم ...... اپنے ذاتی گھر نہ بناسکیں لیکن امت کے بچے کھچے گھر بچ جائیں ...... کہیں عراق وشام، قبائل وافغانستان نہ بنادیے جائیں ...... تو سودا مہنگا نہیں ...... کرلینا چاہئے ...... اور جنھوں نے کرلیا انھیں پوراکرنا چاہیے کہ سب وعدے اِس سودے کو پورا کرنے والوں کے ساتھ ہی ہیں۔ وذٰلک هو الفوز العظيم .... واقعی یہ بہت کامیاب سودا ہے جس میں خسارہ ہے ہی نہیں!

وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه وسلم!